انتخاب سے متعلق احکام ۔ جدید اصطلاح میں اس کو القانون الدستوری کہتے ہیں ۔

۷۔ اسلامی سلطنت کی آمدنی واخراجات ، عوام اور حکومت کے درمیان مالی تعلقات ، غریبوں اور امیروں سے متعلق ۔ روابط سے متعلق احکام ۔ جدید اصطلاح میں ان کو فقہ الاقتصاد یا قانون مالیات کہتے ہیں ۔

۸۔ جرم وسزا سے متعلق احکام ۔ جدید اصطلاح میں اس کو التشریع الجنائی یا قانون العقوبات کہتے ہیں ۔ یعنی قانون فوجداری ۔

شرعی احکام کے اس مختصر سے جائزہ سے شریعت کی جامعیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جدید وضعی وملکی قوانین میں یہ وسعت موجود نہیں ہے ۔

اسلامی شریعت کے معاملات میں دینی واخلاقی پہلو کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے ۔ بلکہ یہ ان کا اصلی جوہر ہیں ۔ کسی فعل کا حقیقت میں حلال وحرام ہونا اس کی باطنی حقیقت پر منحصر ہے ۔ بعض اوقات ایک فعل ظاہری شرائط کی تکمیل کے سبب ظاہر میں صحیح ودرست قرار پاتا ہے ۔ لیکن اس کے مرتکب کی نیت و قصد کے سبب حقیقت میں وہ حرام ہوتا ہے ۔ جیسے کوئی شخص دوسرے پر قرض کا جھوٹا دعوی کرے ۔ اور جھوٹے گواہوں کے ذریعہ قاضی کے سامنے اس کو ثابت بھی کردے ۔ ظاہر میں تو یہ قرض ثابت ہو جائے گا ۔ لیکن حقیقت میں مدعی کے لئے اس رقم کا لینا حرام ہوگا ۔ حقوق میں کسی فعل کے حلت وحرمت سے متعلق قاعدہ یہ ہے کہ وہ فعل ظاہر وباطن دونوں اعتبار سے حلال یا حرام ہو ۔ لیکن باطن چونکہ ایک مخفی چیز ہے ۔ اس لئے اسلامی شریعت نے ظاہر کا اعتبار کیا ہے ۔ اور ظاہر کی صحت کو باطن کی صحت قرار دیا ہے ۔ ظاہری فیصلہ کے بعد بھی ایک چیز حلال اور حرام ہوسکتی ہے ۔ کیونکہ اس کی بنیاد باطنی حقیقت ہے ۔ ظاہری فیصلہ نہ حلال کو حرام بنا سکتا ہے اور نہ حرام کو حلال ۔ قاضی یا عدالت کے ظاہری فیصلہ کے بعد بھی ایک مسلمان کا فرض ہے کہ اس معاملہ پر غور کرے ۔ اگر واقعی اس کا حق ہے تو لے ، ورنہ چھوڑ دے ۔ اس کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے ہوتی ہے ۔ آپ نے فرمایا میں ایک انسان ہوں ۔ تم اپنے مقدمات میرے پاس لے کر آتے ہو ۔ ممکن ہے تم میں سے ایک فریق اپنی دلیل بیان کرنے میں دوسرے سے زیادہ زبان آور ہو ۔ میں جس طرح اس سے سنتا ہوں اس کے مطابق فیصلہ کردیتا ہوں ۔ اگر میں کسی شخص

کے حق میں اس کے بھائی کے حق سے کسی چیز کے دینے کا فیصلہ کروں تو وہ نہ لے (اگر وہ سمجھتا ہے کہ اس نے دھوکا دیا ہے، اور یہ اس کا حق نہیں ہے) میں اس کو آگ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دیتا ہوں[۱]۔
سارے معاملات میں یہی اصول کارفرما ہے کیونکہ شریعت نے ظاہر کے ساتھ ساتھ انسان کے ضمیر اور باطن کو بھی جھنجوڑا ہے۔ یہی چیز اس کو سیکولر نظام قانون سے ممتاز کرتی ہے۔

اسلامی شریعت کی تعریف، اس کی خصوصیات، اس کے مقاصد، اس کی ہمہ جہتی اور اس کے شرعی احکام کے اس مختصر سے تجزیہ کے بعد اب ہم قرآن مجید کی اس آیت کو غور سے پڑھیں اور سمجھیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شریعت کی اتباع کا حکم کیوں دیا گیا ہے اور مسلمانوں کو اس کو اپنا لائحہ عمل بنانے کی کیوں تاکید کی گئی ہے۔ ارشاد باری ہے۔

ثم جعلنٰك على شريعة من الامر فاتبعها ولا تتبع اهواء الذين لا يعلمون (الجاثیہ - ۱۸) ترجمہ:- پھر ہم نے آپ کو (اے پیغمبر) دین کے ایک خاص راستہ پر قائم کر دیا۔ آپ اسی راستہ پر چلئے اور ان لوگوں کی خواہشات پر نہ چلئے جو علم صحیح سے بے بہرہ ہیں۔

---

[۱] ابو داؤد۔ سنن۔ کتاب الادب

Fikr-o-Nasar (Islamabad) 20:9-10 (1983)

اسلامی شریعت کے بنیادی ماخذ

پروفیسر انوار اللہ

اسلامی قانون کے بنیادی ماخذ چار ہیں۔ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اجماع، اور قیاس، یعنی ان چار دلائل سے شریعت کے احکام وضع کئے جاتے ہیں۔ اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے اور ان کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ اگر کوئی واقعہ پیش آجائے اور اس کے لئے کوئی حکم مطلوب ہو تو سب سے پہلے کتاب اللہ یعنی قرآن کریم میں اس کو دیکھا جائے گا پس اگر اس میں پایا گیا تو اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔ اور اگر اس میں اس کا حکم نہیں پایا گیا تو پھر سنت رسول میں اس کو دیکھا جائے گا۔ تو اگر اس میں پایا گیا تو اسی پر فیصلہ کیا جائے گا۔ اگر سنت میں بھی اس کا حکم نہیں ملا تو پھر یہ دیکھا جائے گا کہ آیا اس قسم کے واقعہ کے متعلق کسی زمانہ میں مسلمانوں کا اجماع ہو گیا ہے اگر ہو گیا ہے تو اسی طرح فیصلہ کیا جائے گا اور اگر نہیں ہوا پھر قیاس سے اس کا حکم نکالا جائے گا۔ اور اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا

اس ترتیب استدلال کی دلیل قرآن کریم کی آیت ہے جس میں ارشاد ہے:۔ یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیئ فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الآخر ذلک خیر واحسن تاویلا۔ (مومنو! خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں ان کی بھی۔ اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اگر خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس میں خدا اور اس کے رسول کے حکم کی طرف رجوع کرو یہ بہت ہی اچھی بات ہے اور اس کا مآل اچھا ہے)

پس اس آیت میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے حکم سے قرآن و حدیث کی اتباع ضروری ہوگئی اور بعض اصولیوں کے ہاں اولی الامر سے مراد وہ حکام ہیں جو قرآن و سنت کی تابعداری کے ساتھ ساتھ تمام مسلمانوں کے مشورہ سے فیصلے کرتے ہیں یا ان سے مراد وہ مجتہدین ہیں جو کسی وقت سب کے سب ایک

بات پر متفق ہو جاتے ہیں جو قرآن و حدیث میں نہ ہو۔ گویا ان دونوں صورتوں میں اجماع کی طرف اشارہ ہے۔ اور اس کی تابعداری ضروری ہے اور متنازعہ واقعہ کو اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کی طرف لوٹانے سے قیاس کی تابعداری ثابت ہوتی ہے جو نہ نص ہے اور نہ اجماع۔ کیونکہ لوٹانے کا مقصد یہ ہے کہ قرآن و سنت میں اس کے لئے کوئی اصل ڈھونڈو اور دونوں میں علت مشترکہ نکالو۔ تو گویا یہ آیت ان چاروں کی اتباع پر دلالت کرتی ہے۔ اگرچہ اور آیات سے بھی ان کی الگ الگ تابعداری کی دلالت ثابت ہے[1]۔

اس کے علاوہ ابو داؤد میں معاذ بن جبلؓ سے مروی ہے کہ جب حضورؐ ان کو یمن کا گورنر مقرر کر کے بھیج رہے تھے تو ان سے کہا اے معاذ! اگر تجھے کوئی واقعہ پیش آئے تو کس سے اس کا فیصلہ کرو گے۔ اُنہوں نے کہا کہ میں کتاب اللہ سے اس کا فیصلہ کروں گا۔ پھر حضورؐ نے پوچھا کہ اگر تم کو کتاب اللہ میں نہ ملے۔ تو انہوں نے کہا کہ رسولؐ اللہ کی سنت سے فیصلہ کروں گا۔ پھر حضورؐ نے پوچھا کہ اگر تم سنت میں نہ پاؤ گے تو انہوں نے کہا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ اس پر حضورؐ خوش ہوئے اور ان کے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ ساری صفات اس اللہ کے لئے ہیں جس نے اپنے رسولؐ کے مقرر کردہ عامل کو اس چیز کی توفیق دی جس سے اس کا رسولؐ خوش ہوتا ہے[2]۔

اس میں اگرچہ اجماع کا ذکر نہیں ہے لیکن یہ اس لئے کہ اس وقت اجماع کا ابھی تصور ہی نہیں تھا۔ کیونکہ حضورؐ ابھی زندہ تھے اور قرآن و سنت ہی دو دلائل تھے۔

اس کے علاوہ بغوی نے میمون بن مہران سے روایت کی ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کے سامنے جب بھی کوئی واقعہ پیش آتا تو وہ سب سے پہلے کتاب اللہ کی طرف نظر کرتے تھے تو اگر اس میں کوئی حکم پاتے تو اُس کے مطابق فیصلہ کرتے۔ اور اگر کتاب اللہ میں نہ پاتے تو پھر سنت کے مطابق فیصلہ کرتے اور اگر سنت میں بھی کوئی حکم نہ پاتے تو معتبر لوگوں کو جمع کرتے اور ان سے مشورہ کرتے تو اگر ان کی رائیں کسی ایک حکم پر متفق ہوتیں تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے۔ اور یہی معمول حضرت عمرؓ کا بھی رہا۔ اور اسی پر تمام صحابہؓ نے بھی اتفاق کیا ہے۔ اور اس ترتیب میں ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں تھا[3]۔

ان چار دلائل اور مآخذ کے علاوہ اور بھی دلائل شرعیہ ہیں لیکن ان پر مسلمانوں کا اتفاق نہیں

---

[1] علم اصول فقہ۔ عبدالوہاب خلاف صفحہ ۲۱ [2] ابو داؤد۔

[3] معالم التنزیل بغوی۔

ہے۔ بلکہ بعض ان سے استدلال کے قائل ہیں اور بعض منکر ہیں۔ وہ ماخذ اور دلائل جن میں فقہا کا اختلاف ہے ان میں سے چند یہ ہیں۔ استحسان، مصالح مرسلہ، استصحاب عرف وغیرہ۔

اب میں ان چار دلائل اور مآخذ کا علیحدہ علیحدہ ذکر کرتا ہوں جن پر تمام امت کا اتفاق ہے۔

کتاب اللہ یا قرآن کریم

کتاب اللہ یا قرآن کریم سے مراد اللہ کا وہ کلام ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا جسے فرشتہ جبرائیلؑ خدا کی جانب سے حضورؐ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے اور جو مصاحف میں تحریر شدہ موجود ہے اور جو حضورؐ سے لے کر آج تک متواتراً منقول ہوتا چلا آیا ہے۔ کتاب اللہ کی اس تعریف سے تمام کتب غیر سماویہ اور کتب سماویہ خارج ہو گئیں۔ اس لئے کہ کتب غیر سماویہ تو کلام انسانی ہیں نہ کہ کلام خداوندی۔ اور کتب سماویہ اس لئے خارج ہوگئیں کہ وہ حضورؐ پر نازل نہیں ہوئی ہیں بلکہ وہ ان سے پہلے انبیاء پر نازل ہوئی ہیں اس کے علاوہ یہ قید کہ جو مصاحف میں تحریر شدہ موجود ہو۔ اس سے منسوخ التلاوہ آیات خارج ہوگئیں۔ اور وحی خفی جو بصورت حدیث امت کے ہاتھوں میں موجود ہے بھی خارج ہو گئی۔ اگرچہ نبیؐ کا کلام بھی وحی ہے لیکن وہ وحی غیر متلو ہے یعنی اس کی تلاوت نہیں کی جاتی اور اس کے الفاظ کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے نہیں لی ہے۔ اگرچہ اس پر عمل ضروری ہے۔ نیز متواتراً منقول کی شرط سے وہ تمام قراءتیں خارج ہوگئیں جو متواتراً منقول نہیں۔

قرآن کریم اللہ کی کتاب کی حیثیت سے اسلامی قانون کا اصل الاصول ہے اور سب سے پہلے ان کے احکام پر واجباً عمل کیا جائے گا۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ بندے کا پہلا تعلق اللہ تعالیٰ سے یہ ہے کہ اس پر ایمان لائے اور اللہ تعالیٰ کا بندے سے پہلا تعلق یہ ہے کہ اپنے رسولؐ پر وحی نازل کرے۔ تو گویا اسلام شریعت یا اس سے قبل شرائع کا پہلا سرچشمہ وحی ہے۔ یہ بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے نازل ہوئی ہے اور جو اس لئے نازل کی گئی ہے کہ اس کے ماننے والے اس پر عمل کریں۔ خود حضور نبی کریمؐ وحی پر عمل کرتے تھے اور ہر معاملہ میں وحی کا انتظار کرتے تھے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ کی اطاعت کا کئی آیتوں میں ذکر ہے۔ وحی کی تابعداری کے ساتھ ساتھ بعض ایسی آیتیں بھی ہیں۔ جن میں قرآن کی تابعداری کا حکم ہے مثلاً سورہ اعراف میں

ارشاد ہے اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم (تم پیروی کرو اس کی جو تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے) تو گویا ان ساری آیات سے مراد قرآن کریم کی پیروی ہے۔

قرآن کریم لفظاً اور معنی دونوں کا نام ہے اس لئے قرآن کریم کے ترجمے قرآن نہیں ہیں۔ چنانچہ اردو یا کسی دوسری زبان میں خالی ترجمہ چھاپنا اس کی تلاوت کرنا اور اسے قرآن جیسا سمجھنا حرام ہے کیونکہ اگر اس شکل کو جائز قرار دیا گیا تو ایک روز تورات وانجیل کی طرح نظم قرآن بھی باقی نہ رہے گا قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ نَزَلَ بِہِ الروح الامین علی قلبک لتکون من المنذرین بلسان عربی مبین (اسے روح الامین نے آپ کے قلب اطہر پر واضح عربی زبان میں نازل کیا ہے تاکہ آپ خبردار کرنے والوں میں سے ہوں)۔ اس آیت میں تین شرائط مذکور ہیں۔ پہلی یہ کہ جسے جبرئیل امین لے کر آئے ہوں۔ دوسری یہ کہ جو حضورؐ پر نازل کیا گیا، اور تیسری جو عربی زبان میں نازل ہو۔ گویا جو عربی میں نہ ہو وہ قرآن نہیں۔ اور اگر وہ عربی ہے لیکن حضورؐ پر نازل نہیں کی گئی تب بھی قرآن نہیں ہے اور حضورؐ پر نازل بھی ہوئی لیکن اسے جبرئیل امین لے کر نہیں آئے تب بھی قرآن نہیں۔

قرآن کریم اسلامی شریعت کے اصول وکلیات کی کتاب ہے۔ اس میں جزوی قوانین کی تفصیل بہت کم ہے۔ علامہ شاطبی نے الموافقات میں لکھا ہے۔ القرآن علی اختصار جامع ولا یکون جامعاً الا والمجموع فیہ امور کلیات (قرآن حکیم مختصر ہونے کے باوجود جامع ہے اور یہ جامعیت اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ اس میں کلیات بیان ہوئے ہوں[2]۔

قرآن کریم میں جو احکام پائے جاتے ہیں ان کو عبدالوہاب خلاف نے تین قسموں میں تقسیم کیا ہے اول اعتقادی احکام یہ وہ احکام ہیں جو کسی بندے پر اللہ، ملائکہ، کتب سماویہ، رسل اور یوم آخرت پر اعتقاد رکھنے کے متعلق واجب ہوتے ہیں۔

دوسرے احکام خلقیہ ہیں اور یہ وہ احکام ہیں جو کسی بندے پر اس لئے واجب ہوئے ہیں۔ تاکہ وہ اچھے اخلاق سے آراستہ ہو اور برے اخلاق سے بچا رہے۔

تیسرے احکام عملیہ ہیں اور ان کا تعلق کسی بندے کے اقوال، افعال، عقود اور تصرفات سے ہے اور ان احکام کا تعلق اسلامی قانون یعنی فقہ سے ہے[3]۔

---

۱ حجۃ اللہ البالغہ جلد اول صفحہ نمبر ۱۷۱ ۲ الموافقات جلد نمبر ۳ صفحہ نمبر ۳۶۷ ۳ علم اصول فقہ عبدالوہاب خلاف ۳۲

قرآن کریم : اللہ تعالیٰ کی آخری وحی ہے اس لئے اس کی تعلیمات ہر دور اور ہر زمانہ کے لئے ہیں۔ اس لئے وہ ہر شعبہ زندگی کے حدود اربعہ بتا کر اس کے لئے اصولی احکام واضح کرتا ہے آگے اس کے جزئیات زمانہ کی ضرورتوں اور تقاضوں پر چھوڑ دیتا ہے۔ مثلاً قرآن حکیم نے حکومت کی نوعیت اور پالیسی متعین کر دی کہ وہ زمین میں اللہ کی نیابت و امانت ہوگی اور زیادہ سے زیادہ الٰہی صفتوں کو اپنے اندر جذب کر کے عدل و مساوات کے اصول پر لوگوں کی مادی و روحانی فوائد کا بندوبست کرے گی اور یہ بات بھی بتا دی کہ حکومت کا انتظام چلانے کے لئے شورائی نظام ہونا چاہئیے۔ اس کے علاوہ اس سلسلہ میں جو باتیں بنیادی حیثیت کی تھیں ان کی وضاحت کر دی لیکن یہ تفصیل نہیں بتائی کہ شورائی نظام کا انعقاد کس طرح ہو؟ حکومت موجودہ طرز کی جمہوری ہو شاہی یا آمرانہ ہو یا فوجی؟ رائے عامہ معلوم کرنے کی کیا صورت ہو؟ وغیرہ۔ اس بارے میں فقہا اور علماء امت نے جزئیات کی تفاصیل بنا کر جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں وہ اگرچہ اپنے اپنے زمانے کے حالات کی مناسبت سے تھیں لیکن وہ ہمارے لئے اس لحاظ سے مشعل راہ ہیں کہ انہوں نے قرآن کریم کے اصول سے جزوی احکام نکالنے کے لئے قواعد و ضوابط وضع کئے۔ جن کی روشنی میں ہم مقصد اور اصول کے پیش نظر اپنے زمانے کے حالات و تقاضا کے مناسب طریقہ کار وضع کر کے جزئیات مرتب کریں گے۔ دراصل طریقہ کار کا تعین بڑی حد تک عوامی شعور اور روح پر موقوف ہے۔ چنانچہ جب کبھی عوامی شعور کی حالت میں تبدیلی ہوگئی یا عوامی روح کروٹ بدلے گی تو لازمی طور سے پرانے طریقہ کار پہ نظر ثانی کرنی پڑے گی۔ اس لئے جزئیات مرتب کرنے والے افراد کے لئے اصول فقہ اور فقہ کا مطالعہ نہایت ہی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ قرآن کریم سے احکام مستنبط کرنے کے لئے چند اور باتوں کا جاننا بھی بہت ضروری ہے جن میں

(۱) ناسخ اور منسوخ یعنی یہ کہ کونسی آیت ناسخ ہے اور کونسی منسوخ۔

(۲) مجمل و مفسر یعنی یہ کہ کون سی آیت اور کون سا لفظ قرآن میں مجمل ہے اور کونسی آیت اور کونسا لفظ شرح و تفسیر کرتا ہے۔

(۳) خاص و عام یعنی یہ کہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے کونسی آیت خاص ہے اور کونسی عام

(۴) محکم و متشابہ یعنی یہ کہ کونسی آیتیں عملی زندگی میں اصل اور بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور انسانی عقل واضح طور پر ان کا ادراک کر سکتی ہے اور کونسی آیات ایسی ہیں جن کا تعلق ایمانیات سے

ہے۔ اور ان کے حقائق ماورائے عقل ہیں کہ واضح طور پر ان کا ادراک ہماری دسترس سے باہر ہے اور ہماری ضرورت اور ذمہ داری میں داخل نہیں ہے۔

(۵) یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ جو کام کرنے ضروری ہیں وہ کس درجہ کے ہیں۔ فرض واجب سنت مستحب وغیرہ اور جو نہ کرنے سے متعلق ہیں۔ ان کی کیا نوعیت ہے۔ حرام۔ مکروہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ قرآن کریم کے احکام سمجھنے کے لئے یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت عربوں میں کیا رسم و رواج قائم تھے اور مختلف معاشرتی قوانین میں ان کا کیا معمول تھا۔ نیز ان کی لغت اور محاورات اور انداز خطاب وغیرہ بھی جاننا ضروری ہے کیونکہ قرآن کریم اسی کے مطابق اُتارا گیا ہے۔

عربوں کے علاوہ پہلی آسمانی شریعتوں سے بھی واقفیت ضروری ہے کیونکہ دین اوّل سے لے کر آخر تک ایک ہی رہا ہے۔ اس لئے جو بھی پیغمبر مبعوث ہوا تو اس نے پچھلی شریعت کے وہ طریقے قائم رکھے جو نئے لوگوں کے لئے مفید ہوں اور ان میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو۔ اسی طرح قرآن کریم نے بھی پچھلی شریعتوں کے کئی امور باقی رکھے ہیں اور وہ ہمارے لئے واجب العمل ہیں۔

اس کے علاوہ قرآن کے احکام سمجھنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی اور مدنی زندگیوں کو سمجھنا اور ان کے درمیان فرق معلوم کرنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ مکی زندگی میں قوم ابھی ابتدائی دور سے گذر رہی تھی۔ نہ اس کی ٹھیک تنظیم ہو پائی تھی اور نہ اس کا اخلاقی شعور پیدا ہوا تھا۔ ایسی حالت میں صرف چند بنیادی عقائد و اعمال کی ضرورت بھی جو بڑی حد تک عام اور مانوس تھیں۔ تاکہ فکری و عملی انتشار ختم ہو کر قوم میں ہمدردی و مرکزیت کی روح پیدا ہو۔ اس لئے اس ابتدائی دور میں قرآن کریم کا جو حصہ نازل ہوا ہے۔ وہ توحید و رسالت، جزا و سزا اور مکارم اخلاق وغیرہ کے بیان تک محدود ہے۔ البتہ اسی کی تقویت کے لئے سبق آموز حالات و واقعات، مذہبی تعلیم کی روح اور الٰہی حکمت سے خود ان کے انحراف کے نتائج وغیرہ کا اجمالاً تذکرہ ہے۔ اس لئے مکی آیتوں میں خطاب عام طور پر یا ایھا الناس سے کیا گیا ہے۔ لیکن مدنی زندگی میں جب قوم ایسے مرحلہ پر پہنچ گئی کہ اس کی ذہنی فضا بڑی حد تک ہموار اور اخلاقی شعور بیدار ہو گیا۔ اور حق و باطل میں امتیاز قائم ہو کر ایک باقاعدہ تنظیم بن گئی تو تفصیل احکام کی ضرورت تھی اور زندگی کے مختلف گوشوں سے متعلق بنیادی ہدایات درکار تھیں۔

اس لئے مدنی آیات میں زیادہ تر خطاب یا ایہا الذین آمنوا سے کیا گیا ہے۔ اس لئے قرآنی احکام تئیس سال کے عرصہ میں حالات و تقاضا کے لحاظ سے نازل ہوئے۔ ابتدا میں مجمل احکام عقائد و عبادات سے متعلق تھے اور بعد میں مفصل احکام معاشرتی و تمدنی معاملات وغیرہ سے متعلق تھے۔ اسی قاعدہ سے قرآن کریم کی نسخ کے مسئلہ کا بھی تعلق ہے۔ نسخ کے کئی معانی بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن یہاں میں شاہ ولی اللہ دہلوی کا معنی بیان کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے نسخ کے دو اقسام بیان کئے ہیں۔ اور دوسری قسم کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ نسخ کی دوسری قسم یہ ہے کہ کسی مصالحت کی رعایت سے یا مفسدہ کے اندیشہ سے کوئی حکم دیا جائے پھر ایسا زمانہ آجائے کہ اس میں یہ مقصود نہ رہ جائے تو وہ حکم بدل جائے گا۔[۱]

اس کے علاوہ قرآنی آیات کی شانِ نزول سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ کیونکہ شانِ نزول میں بیان کردہ واقعہ کی وہ حالت و کیفیت مقصود ہوتی ہے۔ جو اس سے ظاہر ہوتی ہے۔ گویا معاشرہ کو جو اطوار مسائل در پیش ہوتے ہیں۔ یہ واقعات ان کی نمائندگی اور نشان دہی کر کے حالات کو سمجھنے کے لئے مواد کی فراہمی کرتے ہیں اور آخر میں عرض کروں کہ قرآن کریم کے احکام میں سے ہر حکم کی علت اور حکمت تلاش کرنا بھی ضروری ہے تاکہ قرآن کریم میں بیان کردہ علتوں سے اور مسائل کا بھی استدلال اور استنباط آسانی سے ہو سکے۔

سُنّت

سُنّت کے لغوی معنی مروجہ طور طریقہ کے ہیں۔ لیکن فقہا کی اصطلاح میں سُنّت سے رسُول اللہؐ کے تمام اقوال و افعال اور دوسروں کے وہ اقوال و افعال مراد ہیں۔ جن کو دیکھ کر آپؐ نے سکوت فرمایا اور ان کو قائم و برقرار رکھا۔

اللہ کی کتاب کے بعد سُنّت رسُول صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی قانون کا دوسرا ماخذ ہے کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے رسُول اللہؐ کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ کئی آیتوں میں ارشاد ہے۔

اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول (اللہ کی اطاعت کرو اور رسُول کی اطاعت کرو) نیز قرآن کریم نے مسلمانوں

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ جلد اوّل صفحہ نمبر ۱۹۲

کو حکم دیا ہے کہ جب ان کا کسی معاملہ میں جھگڑا ہو جائے تو اس کے تصفیے کے لئے اللہ اور رسول کی طرف اس کو لوٹاؤ) چنانچہ ارشاد ہے۔ فان تنازعتم فی شئ فردوہ الی اللہ والرسول (اور اگر تم کسی چیز میں جھگڑ گئے تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ)۔ نیز اللہ تعالیٰ نے اپنے اور رسولؐ کے فیصلے کے کسی مومن کو یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ اس میں اپنی مرضی اختیار کرے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وما کان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم (کسی مومن مرد یا مومنہ عورت کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی معاملہ میں فیصلہ کرے وہ اس میں اپنی مرضی اختیار کرے)

نیز قرآن کریم نے اس آدمی سے ایمان کی نفی کی ہے جو رسولؐ کے فیصلہ پر مطمئن نہ ہو اور اس پر سر جھکانے کے لئے تیار نہ ہو) چنانچہ ارشاد ہے۔ فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیماً (پس (اے حبیب) آپ کے پروردگار کی قسم یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے جب تک آپس کے ہر اختلاف میں آپ کو دل وجان سے حکم نہ بنائیں۔ پھر جو فیصلہ آپؐ کر دیں اس سے کسی طرح دل گیر بھی نہ ہوں اور اسے دل سے خوشی خوشی قبول کریں) نیز قرآن کریم نے رسولؐ کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت قرار دی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (جس نے رسولؐ کی اطاعت کی تو گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی) اس کے علاوہ قرآن کریم نے حکم دیا ہے کہ جو کچھ رسولؐ آپ کو دیں یعنی جس کام کے کرنے کا رسولؐ آپ کو حکم دے وہ کرو اور جس کام کرنے سے آپ کو منع کرے اس سے منع ہو جاؤ۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا (جو حضورؐ آپ کو دیں سے لے لو اور جس سے منع کریں اس سے منع ہو جاؤ)

اس کے علاوہ قرآن کریم نے رسولؐ کے متعلق کئی جگہوں پہ فرمایا ہے کہ وہ کتاب اور

حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ مثلاً ارشاد ہے۔ لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولاً منھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ (بے شک اللہ نے مومنوں پر احسان کیا کہ ان میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے اور ان کو پاک کر دیتا ہے اور اُن کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے) یا مثلاً ایک دوسری آیت میں ہے وانزل علیک الکتاب والحکمۃ (اور اس نے (اللہ نے) آپ پر کتاب اور حکمت کو نازل کیا ہے) اور بھی بہت سی آیتیں ہیں جن میں کتاب اور حکمت کا ایک ساتھ ذکر آیا ہے۔ تو امام شافعی فرماتے ہیں کہ حکمت سنتِ رسول اللہ ہی ہے۔ گویا ان آیات میں حکمت سے مراد سنتِ رسولؐ ہے اس لئے ان آیات سے قرآن اور سنتِ رسولؐ دونوں کی اطاعت اور پیروی لازماً ثابت ہوتی ہے۔

ان سب کے علاوہ قرآن کریم میں ہے کہ رسولؐ بحیثیت رسولؐ جو کچھ بھی فرماتے ہیں وہ وحی ہے یعنی من جملہ کتاب اللہ ہے اور اس لئے اس کی تابعداری فرض اور ضروری ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ (اور وہ (رسولؐ) اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتا بلکہ یہ تو وحی ہے جو اس کی طرف کی جاتی ہے)[1]

آخری یہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی چیزیں فرض کی ہیں۔ اور ان کو مجمل بیان کیا ہے جن کی تفصیل نہیں بیان کی گئی ہے۔ مثلاً نماز کے بارے میں حکم ہے۔ اقیموا الصلوٰۃ (نماز قائم کرو) لیکن یہ نہیں بیان فرمایا کہ کس طرح قائم کیا جائے۔ کتنی رکعات ہوں۔ وغیرہ وغیرہ اسی طرح زکوٰۃ، حج، روزہ وغیرہ ہیں جن کی تفصیل قرآن میں نہیں آئی ہے۔ صرف مجمل حکم ہے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجمال کو قولی یا فعلی طریقہ سے بیان فرمایا۔ تو اگر ان بیانات کو ضروری قرار نہ دیا جائے تو قرآن کے مجمل حکم پر عمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ سنتِ رسولؐ بھی فرض ہو جو کتاب اللہ کے کسی حکم کی وضاحت اور بیان کرے۔ چنانچہ علامہ شاطبی نے لکھا ہے۔ فکان السنۃ بمنزلۃ التفسیر والشرح لمعانی احکام الکتاب (گویا سنت قرآنی احکام و معانی کے لئے تفسیر اور شرح کی حیثیت میں ہو گئی ہے)[2]

---

[1] الرسالۃ للامام الشافعی صفحہ ۱۲۹ [2] الموافقات جلد ۴ صفحہ ۱۰۴

سُنت کی اس حیثیت کی وضاحت قرآن کریم کی کئی آیات میں کی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون (اور ہم نے آپ پر الذکر (قرآن) نازل کیا تاکہ جو تعلیم لوگوں کی طرف بھیجی گئی ہے۔ وہ ان کو واضح کر دیں اور تاکہ وہ لوگ غور و فکر کریں) ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے۔ انا انزلنا الیک الکتٰب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ (اے پیغمبر ہم نے آپ پر سچائی کے ساتھ کتاب نازل کر دی تاکہ جیسا کچھ اللہ نے بتلا دیا ہے۔ آپ اس کے مطابق فیصلہ کریں)۔

قرآن کریم کے علاوہ خود سنت میں بھی سنت کے حجت اور اس کے قرآن کے بعد ماخذ قانون ہونے کا ذکر ہے۔ چنانچہ حدیث معاذ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ جس میں حضرت معاذ رض نے حضورؐ کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ اگر میں کتاب اللہ میں کوئی چیز نہ پاؤں تو پھر سنت کے مطابق فیصلہ کرونگا۔ اور اسی کو حضورؐ نے پسند فرمایا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بھما کتاب اللہ وسنتی (میں تم میں دو چیزیں چھوڑتا ہوں کہ جب تک تم ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رکھو گے (یعنی ان پر عمل کرتے رہو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہوں گے کتاب اللہ اور میری سنت)

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ الا انی اوتیت الکتاب ومثلہ معہ (خبردار مجھے کتاب بھی دی گئی ہے اور اس کی طرح اس کے ساتھ ایک اور چیز بھی یعنی میری سنّت)

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ علیکم سنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین (تم پر لازم ہے کہ میری سنّت کی پیروی کرو اور خلفاء راشدین کی سنت کی بھی جن کو ہدایت دی گئی ہے) ان کے علاوہ اور بھی کئی احادیث سے سنّت کی تابعداری اور ماخذ قانون ہونا ثابت ہے۔

اس کے علاوہ پوری امت مسلمہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ سنت رسولؐ کی تابعداری فرض اور ضروری ہے اور کسی کا اس بات میں اختلاف نہیں ہے کہ سنت رسولؐ اگر صحیح طریقہ سے منقول ہو تو اس کی پیروی ضروری ہے۔ چنانچہ صحابہؓ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بھی

ان کی ہر کلام میں تابعداری کرتے تھے اور جب آپ وفات پاگئے تو جب وہ کتاب اللہ میں کوئی حکم نہیں پاتے تھے تو پھر سنت کی طرف رجوع کرتے تھے۔ چنانچہ ابوبکرؓ اپنے دور خلافت میں جب کسی واقعہ کا حکم کتاب اللہ میں نہیں پاتے تو پھر لوگوں سے پوچھتے کہ کیا تم میں کوئی ایسا آدمی ہے جس کو اس سے متعلق سنت کا کوئی حکم معلوم ہو؟ اور یہی معمول حضرت عمرؓ کا بھی تھا اور یہی معمول بعد میں قائم رہا۔

سنت کبھی کبھی قرآن کریم کی کسی مجمل آیت کی تفصیل بیان کرتی ہے۔ مثلاً نماز کی مجمل حکم کی تفصیل بیان کی یا قرآن کے عام حکم کو خاص کرتی ہے یا قرآن کے مطلق حکم کو مقید کرتی ہے۔ مثلاً السارق والسارقة فاقطعوا ایدیھما (چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دیں) اس میں مطلق چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا بیان ہوا یا یہ کہ عام چور کی سزا ہاتھ کاٹنا بیان ہوا لیکن سنت نے اس کو اس چوری سے مقید اور خاص کر دیا جو ربع دینار سے کم نہ ہو۔ یا مثلاً قرآن کریم نے مطلق فرمایا۔ احل اللہ البیع وحرم الربوا (اللہ نے خرید و فروخت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے) تو اس میں مطلق خرید و فروخت حلال ہے لیکن احادیث نے صحیح اور فاسد خرید و فروخت میں تمیز کی اور پہلے کو جائز اور دوسرے کو ناجائز قرار دیا۔ اسی طرح قرآن کریم میں عام مردار کو حرام قرار دیا گیا لیکن حدیث نے اس کو خاص کیا اور سمندری مردار کو اس سے نکال دیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ سنت میں بعض مستقل احکام ہوتے ہیں۔ جن کا کسی طرح ذکر قرآن کریم میں نہیں ہوتا۔ تو گویا وہ حکم اصلاً سنت ہی سے ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً حضورؐ نے فرمایا۔ یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب (رضاعت سے ہر وہ رشتہ حرام ہوتا ہے جو نسب سے حرام ہوتا ہے) یا جیسا کہ حضورؐ نے ریشمی لباس منع فرمایا وغیرہ وغیرہ۔

چونکہ سنت کی تدوین حضورؐ یا صحابہ کرام کے زمانہ میں نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس وقت زیادہ توجہ قرآن کریم کی تدوین پر دی گئی، اور سنت چونکہ سب کو معلوم اور یاد تھی اس لئے اس کی تدوین کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ سنت کی کتابی شکل میں تدوین ہونی چاہیئے اور آخر یہ کام شروع ہو کر بعد میں تکمیل کو پہنچا۔ ابتداً میں جملہ احادیث کی تدوین کی گئی۔ بعد میں صحیح اور غیر صحیح کی تفریق کر دی گئی۔ اس کے لئے قواعد و ضوابط

مقرر ہوئے جس نے دو مستقل علوم کی شکل اختیار کی۔ یعنی علم اسما الرجال اور علم اصولِ حدیث۔ اس لئے احادیث کے سمجھنے اور ان سے احکام مستنبط کرنے کے لئے ان دونوں علوم سے پوری واقفیت نہایت ہی ضروری ہے۔ علم الرجال میں احادیث کے راویوں سے بحث ہوتی ہے اور ہر راوی کے زندگی کے حالات اور اس کے اخلاق و کردار وغیرہ کو بیان کیا جاتا ہے۔ تاکہ اس کی روایت کردہ حدیث کی قوت اور ضعف معلوم ہو سکے۔ علم اصول حدیث میں حدیث کی سند اور متن سے متعلق جملہ اصول بیان کئے جاتے ہیں۔ مثلاً سنت متواترہ، سنت مشہورہ اور سنت آحاد وغیرہ۔

یہاں یہ بھی بیان کرنا ضروری ہے کہ جس طرح کتاب اللہ میں سے احکام مستنبط کرنے کے لئے اس میں ناسخ و منسوخ، عام و خاص، مطلق و مقید وغیرہ کا جاننا ضروری ہے اسی طرح سُنّت میں بھی ان چیزوں کا جاننا نہایت ہی ضروری ہے اس کے علاوہ عربوں کے حالات اور ما قبل شرائع سے واقفیت بھی ضروری ہے کیونکہ حضورؐ ان ہی میں مبعوث ہوئے۔

یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو اقوال یا افعال صادر ہوئے ہیں۔ ان کی تابعداری مسلمانوں پر تب فرض ہے کہ وہ آپؐ سے رسُول ہونے کی حیثیت سے صادر ہوئے ہوں اور ان سے مقصود تشریع اور اقتدار ہو۔ کیونکہ حضورؐ باقی انسانوں کی طرح ایک انسان تھے جن کو اللہ تعالےٰ نے لوگوں کی تبلیغ کے لئے پسند فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ قل انما انا بشر مثلکم یوحی الیّ (کہہ دیجئے (اے پیغمبر) میں تمہاری طرح ایک بشر ہوں۔ میری طرف وحی کی جاتی ہے)۔ اس بناء پر جو اقوال و افعال آپؐ سے انسانی بشری حیثیت سے صادر ہوئے ہیں۔ مثلاً اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا سونا وغیرہ تو یہ تشریعی نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کی بنیاد رسالت نہیں ہے۔ بلکہ انسانیت ہے۔ اسی طرح جو اقوال و افعال آپؐ سے عام انسانی تجربے یا تفنن طبع کے طور پر صادر ہوئے ہوں وہ بھی تشریعی نہیں ہے۔ مثلاً ایک لڑائی میں حضورؐ نے فرمایا کہ فلاں جگہ فوج اُترے تو بعض صحابہؓ نے پُوچھا کہ اس جگہ اترنے کا اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو حکم دیا ہے یا یہ رائے یا لڑائی اور چال ہے تو حضورؐ نے فرمایا۔ نہیں یہ رائے، لڑائی اور چال ہے۔ اس پہ ایک صحابی نے کہا کہ یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے اور ایک دوسری جگہ کی طرف اشارہ کیا اور اس کی لڑائی کی نقطہ نظر سے اہمیت حضورؐ کو بیان کی۔ اسی طرح جب آپؐ نے اہل مدینہ کو کھجوروں میں نال کرتے ہوئے دیکھا تو آپؐ نے اشارۃً فرمایا کہ نال مت

کرو۔ تو انہوں نے نال چھوڑ دیا۔ جس سے ان کے کھجور کم ہو گئے تو پھر حضورؐ نے فرمایا کہ نال کیا کرو۔ تم اپنے دنیوی کاموں میں زیادہ جانتے ہو۔ تو یہ تمام سنت ہیں۔ لیکن ان کی تابعداری قانون کی طرح ضروری نہیں ہے۔ ان میں وہ اقوال رسُول بھی شامل ہیں جو عرب میں بطور قصہ مشہور تھے۔ رسُول اللہؐ نے بھی تفنن طبع کے طور پر بیان فرمائیں۔ یا جو آپؐ نے عربوں کے بعض تجربات، علاج، زراعت و باغبانی وغیرہ کے متعلق جو چیزیں بیان فرمائیں۔

سنت کا محل و مقام متعین کرنے میں رسول اللہؐ کے صحابہؓ کی زندگیاں خاص اہمیت رکھتی ہیں اس لئے فقہائے کرام نے ان سے بہت استفادہ کیا ہے اور ان کے مکمل اور تشریحی بیان کو بطور حجت تسلیم کیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے قرآن کے احوال و اسباب اور اسرار شریعت کا بچشم خود مشاہدہ کیا ہے اور اسباب تنزیل کی معرفت حاصل کی ہے۔

اجماع

اسلامی قانون کا تیسرا ماخذ اجماع ہے۔ لغت میں اجماع کے معنی عزم و اتفاق ہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔ فاجمعوا امرکم و شرکاءکم (تم اپنی بات طے کر لو اور اپنے شریکوں کو اکٹھا کر لو)۔ اصطلاح میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے۔ ہو اتفاق جمیع المجتہدین من المسلمین فی عصر واحد بعد وفات الرسول علی حکم شرعی فی واقعۃ (یہ رسُول اللہ کی وفات کے بعد کسی زمانہ میں تمام مسلمان مجتہدین کا کسی واقعہ میں کسی شرعی حکم پر اتفاق کرنا ہے)

اجماع کی اہمیت اور ضرورت اس بناء پر ہے کہ قرآنی اصُول کلیات اور نبوی تشریحات اپنے اپنے رنگ میں جامع ہونے کے باوجود نت نئے حالات و مسائل کے تذکرہ سے خالی ہیں۔ ایسی حالت میں فطری طور پر کسی ایسی شکل کی ضرورت ہے جو نت نئے حالات و مسائل کا حل تلاش کر سکے اور ان کو الٰہی قوانین کے مطابق ڈھال کر لوگوں کے لئے قابلِ عمل بنائے اور مذکورہ ضرورت کے پیش نظر اس اہم کام کی انجام دہی کے لئے مقررہ اصُول و ضوابط کے مطابق جو اجتماعی شکل متعین ہوگی۔ اس کی حیثیت اجماع کی ہوگی۔

قرآن کریم کی کئی آیات میں اجماع کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کی پیروی لازمی قرار دی گئی ہے۔ مثلاً

ارشاد ہے۔ یا ایھا الذین اٰمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر (اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی اطاعت کرو جو اولی الامر ہیں (یعنی ارباب حکومت ہیں یا مجتہدین ہیں)۔ ایک دوسری آیت میں ہے۔ ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الھدیٰ ویتبع غیر سبیل المؤمنین نوله ما تولیٰ ونصله جھنم (جو شخص اللہ کے رسول کی مخالفت کرے اور مومنوں کی راہ چھوڑ کر دوسری راہ چلنے لگے تو ہم اس کو اسی طرف لے جائیں گے جس طرف کو جانا اس نے پسند کر لیا ہے اور اسے دوزخ میں پہنچا دیں گے) ایک اور آیت میں ہے۔ وکذلك جعلناکم امۃ وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس (اسی طرح ہم نے تمہیں امت وسط (معتدل) بنایا تاکہ تم تمام انسانوں کے لئے سچائی کی شہادت دینے والے ہو)۔ یہ اور ان کے علاوہ اور بھی کئی آیتیں ہیں، جن سے فقہانے اجماع اور اس کی اہمیت ثابت کی ہے۔

اجماع کے ثبوت میں اہم اور مستند دلیل اسلام کا شورائی نظام ہے جو ہر شعبہ کو حاوی ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے۔

وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ (معاملات میں آپ ان سے مشورہ کر لیا کریں پھر جب مشورہ کے بعد کسی بات کا عزم کر لیں تو اللہ پر بھروسہ کریں) اس آیت کے سیاق وسباق، انداز بیان اور الفاظ کی عمومیت وغیرہ سے اجماع کی اصلیت پر روشنی پڑتی ہے اس آیت پر عمل کرتے ہوئے رسولؐ صحابہ کرامؓ سے قانونی وغیر قانونی تمام اہم معاملات میں مشورہ کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ قرآن کریم میں صحابہ اور دیگر اہل ایمان کی زندگی کا شیوہ یہ بیان کیا گیا ہے۔ وامرھم شوریٰ بینھم (اور ان کے معاملات باہمی مشورہ سے طے ہوتے ہیں) خواہ قانونی معاملہ ہو یا غیر قانونی، مشورہ کی ضرورت وہی ہو گی جہاں صراحت نہ ہو اور معاملہ کا کوئی واضح حل نہ ہو۔ اور مطلوبہ حل کے لئے آپس میں مشورہ کیا جائے۔

سنت قولی میں بھی اجماع کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں حضورؐ کا ارشاد ہے۔ ما راٰہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن (جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا لا تجتمع امتی علی علی الضلالۃ (میری امت ضلالت پر متفق نہ ہو گی) ان روایتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی طرف سے امت مسلمہ پر ضمانت اور اعتماد کا اظہار ہے۔ اور یہ اعتماد اور ضمانت ایک بھاری ذمہ داری ہے جسے نبٹانے کے لئے سخت قسم کی شرطیں اور اعلیٰ صلاحیت اور اہلیت درکار ہے اس لئے علامہ شوکانی نے ارشاد الفحول میں لکھا ہے۔ لا اعتبار بقول العوام فی الاجماع لا وفاقاً ولا خلافاً عند الجمهور لانهم ليسوا من اهل النظر فی الشرعيات ولا يفهمون الحجة ولا يفهمون البرهان[1] (اجماع میں عوام کے قول کا اعتبار نہیں ہے نہ اتفاق میں اور نہ مخالفت میں۔ جمہور فقہا کا یہی مسلک ہے کیونکہ شرعی معاملات میں نہ وہ اہل نظر ہیں اور نہ ہی دلیل وحجت کو سمجھتے ہیں)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرام کے طرز عمل سے بھی اجماع کے ثبوت پر روشنی پڑتی ہے۔ بلکہ فقہاء نے اہل اجماع کے لئے جو سخت شرطیں لگائی ہیں۔ وہ سب اسی دور کے لوگوں میں موجود تھیں۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں اس مقصد کے لئے جلیل القدر صحابہ کو باہر جانے سے روک دیا گیا تھا اور تمام پیش آمدہ مسائل میں ان سے مشورہ کیا جاتا تھا اور باہمی مشورہ سے جو بات طے ہو جاتی اس پر عمل درآمد ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے حضرت عمرؓ کی خلافت ایک اچھی مثال ہے کیونکہ اس دور میں بکثرت نئے مسائل پیش آئے اور ان کو باہمی مشورہ سے طے کیا گیا۔ نیز اس دور میں حج کے اجماع سے بھی فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔ یہی معمول حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کا بھی رہا۔ صحابہ کے بعد یہ عمل بعض ان اموی خلفاء کے دور میں بھی جاری رہا جو اندلس میں خلافت کرتے تھے جنہوں نے دوسری صدی ہجری میں علماء کی ایک جماعت اس غرض کے لئے مقرر کی تھی کہ ان سے شرعی امور میں مشورہ لیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اندلس کے بعض علماء کے تذکرے میں یہ لکھا جاتا ہے کہ وہ شوریٰ کے علماء میں سے تھے[2]

لیکن ان ادوار کے بعد اس طریقہ پر اجماع کا عمل جاری نہ رہا اور شرعی امور کا اجماع سے فیصلہ نہیں ہوتا تھا بلکہ ہر مجتہد اپنی اجتہاد سے اپنے شہر اور علاقے میں شرعی امور کے بارے میں فیصلہ دیتا تھا۔ گویا تشریعی کام انفرادی ہو گیا اور اجماعی نہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی تو اُن کی رائیں متفق ہو جاتی

---

[1] ارشاد الفحول۔ شوکانی صفحہ نمبر ۷۵ا۔

[2] علم اصول الفقہ۔ عبدالوہاب خلاف صفحہ نمبر ۵۔

تھیں اور کبھی مختلف۔ زیادہ سے زیادہ ایک فقیہ کسی واقعہ کے متعلق یہ کہتا کہ اس کے حکم میں کسی کی مخالفت کا علم نہیں ہے۔

جن لوگوں سے اجماع کا انعقاد معتبر سمجھا جاتا ہے۔ان کے لئے فقہاء نے بعض شرائط مقرر کی ہیں جو مختصراً یہ ہیں:-

(۱) قرآن حکیم میں حکمت و بصیرت کا درجہ یا کم از کم علم کا مقام حاصل ہو۔

(۲) سنت نبوی کو روایت اور درایت کے معیار سے جانچنے کے طریقے سے پوری واقفیت اور اس کے صحیح مقام و محل کی تعیین کی معرفت ہو۔

(۳) صحابہ کرامؓ کی زندگی سے واقفیت اور ان کے اجماع اور فیصلہ کا علم ہو۔

(۴) قیاس کے ذریعے استنباط کے اصول و قواعد معلوم ہوں

(۵) قوم کے مزاج ، حالات و تقاضوں، رسم و رواج اور عادات و خصائل سے بھی واقف ہونا ضروری ہے۔

(۶) جدید رجحانات اور تقاضوں سے واقفیت کے لئے ایسے حضرات کو شامل کیا جائے جو ان معاملات میں سنجیدگی اور بصیرت کے ساتھ رائے دے سکیں۔

چنانچہ فنی امور میں ان لوگوں کا اجماع معتبر ہے۔جو ان امور میں مہارت رکھتے ہوں۔باقی عملی حیثیت سے ان کا کردار ایسا ہونا چاہیئے کہ فسق و فجور اور بری عادتوں سے اجتناب کریں۔یعنی علانیہ فسق کے مرتکب نہ ہوں۔اور شریعت کے ماموارت پر عمل کرتے ہوں اور منہیات سے بچتے ہوں۔ان کے لئے تقویٰ کا کوئی خاص معیار متعین نہیں ہے۔

اس سے متعلق اجماع کا وہ پہلو بھی ہے کہ بعض فقہاء حنبلیہ اس بات کے قائل ہیں کہ اجماع میں سارے مجتہدین کا متفق ہونا اور ایک بات پر جمع ہونا ضروری ہے۔اگرچہ ایک بھی رہ جائے تب بھی اجماع نہیں ہے۔اسی طرح اگر ایک علاقے کے مجتہدین ایک مسئلہ پر متفق ہو جائیں تو بھی وہ اجماع شرعی نہیں ہے[1]۔

امام احمدؒ بن حنبل کی ایک روایت اور شیخ محی الدین بن عربیؒ کے نزدیک صرف صحابہؓ کا اجماع

---

[1] علم اصول الفقہ عبدالوہاب صفحہ نمبر ۴۶۔

معتبر ہے۔ کیونکہ حضورؐ نے ان کی تعریف کی ہے۔ اور ان کی بہتری اور صلاحیت کا اقرار کیا ہے شیعہ کے ہاں صرف اہل بیت کا اجماع معتبر ہے۔ وہ اس ضمن میں ایک روایت سے استدلال کرتے ہیں جس میں حضورؐ نے فرمایا۔ انی ترکت فیکم ما ان تمسکتم بہ لن تضلوا بعدی کتاب اللہ و عترتی (بیشک میں تم میں ایسی چیزیں چھوڑتا ہوں کہ جب تک تم ان کو مضبوطی سے پکڑو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہوں گے۔ کتاب اللہ اور میری اہل بیت) امام مالک کے نزدیک اہل مدینہ کا اجماع معتبر ہے[۱]

لیکن بعض فقہا کے ہاں اجماع کے انعقاد کے لئے صاحب صلاحیت افراد کا کثیر تعداد میں ہونا ضروری نہیں بلکہ نہ ہونے کی صورت میں کم از کم تین بھی کافی ہیں۔ لیکن جتنے ہوں وہ پوری امت سے منتخب شدہ اور خاص اہمیت کے حامل ہوں۔ اسی طرح فیصلہ میں ہر حیثیت سے سب کا متفق ہونا لازمی نہیں ہے بلکہ اکثریت کا اتفاق کافی ہے۔ صحابہ کرام کی زندگی اور ان کی طرز عمل میں اس کا ثبوت ملتا ہے۔ امام غزالیؒ نے المستصفی میں لکھا ہے۔ ان ینعقد مع مخالفۃ الاقل (اجماع منعقد ہو جاتا ہے اقلیت کے اختلاف کے باوجود)[۲]۔

اس کے علاوہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے یہ رائے دی ہے جو اجماع لوگوں کے خیال میں ہے اس میں ساری امت کا صراحۃً اتفاق پایا جائے اور کوئی بھی اس سے الگ نہ رہے یہ خیال محال اور یہ کبھی بھی نہیں واقع ہوا ہے۔ البتہ کثیر الواقع اجماع یہ رہا ہے کہ شہر کے مفتیوں میں سے اہل حل وعقد کا اتفاق ہو اجماع کا یہی مفہوم ان مسائل میں پایا جاتا ہے۔ جو فاروق اعظم کے تصریح کردہ ہیں کہ ان پر اہل حل وعقد نے اتفاق کر لیا تھا۔ پھر اس کے بعد وہ اجماع ہے۔ جس میں بڑی جمعیت کا فتویٰ اور باقی لوگوں کا سکوت ہو پھر وہ ہے کہ جس میں دو مختلف قول ہوں کہ تیسرے قول کی نفی پر اتفاق ہوتا ہے۔ پھر اہل حرمین اور خلفاً کا اتفاق ہے[۳]

اس کے علاوہ اجماع کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اجماع صریح اور وہ یہ ہے کہ کسی زمانے کے سارے مجتہدین ایک واقعہ کے حکم پر متفق ہو جائیں اور صراحۃً اپنی رائے کا اظہار کریں خواہ فتویٰ سے یا قضا سے۔ یعنی ہر مجتہد سے کوئی ایسا قول یا عمل سرزد ہو جائے جس سے اس کی رائے کی صراحت معلوم ہو۔

---

[۱] نور الانوار صفحہ نمبر ۲۲۴ [۲] المستصفی جلد نمبر ۲ صفحہ نمبر ۱۸۶ [۳] فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر محمد تقی امینی صفحہ نمبر ۱۵۴۔

دوسری قسم اجماع سکوتی ہے کہ کسی زمانے کے بعض مجتہدین کسی حکم پر اپنی رائے کا صراحتہً اظہار کریں اور بعض دوسرے صراحتہً اپنی رائے کا اظہار نہ کریں بلکہ اس پر خاموش رہیں۔ یعنی نہ انکار کریں اور نہ اقرار۔ لیکن اجماع صریح قطعی الدلالت ہے اور اس کی پیروی فرض اور ضروری ہے۔ اس کا حکم آخری ہے جس میں کسی کو اجتہاد کی گنجائش ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ دراصل بعض مجتہدین کی رائے ہے نہ کہ کل کی۔[1] لیکن بعض فقہاء نے اجماع سکوتی کو بھی حجت تسلیم کیا ہے۔[2]

قیاس

قیاس کے لغوی معنی اندازہ کرنا ہیں۔ فقہاء کی اصطلاح میں علت کو مدار بنا کر فیصلہ کرنا اور نظیر کی روشنی میں نئے مسائل حل کرنے کو قیاس کہتے ہیں۔ اس کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

" الحاق امر بامر فی الحکم الشرعی لاتحاد بینہما فی العلتہ "

" دو مسئلوں میں اتحادِ علت کی وجہ سے جو حکم ایک مسئلہ کا ہے وہی حکم دوسرے مسئلہ کا قرار دینا۔"

اصول فقہ کی عام کتابوں میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

" تقدیر الفرع بالاصل فی الحکم والعلتہ "

حکم اور علت میں فرع (نیا مسئلہ) کو اصل (سابق حکم) کے مطابق کرنا "

جب کسی واقعہ میں نص سے کوئی حکم وارد ہوا ہو اور جن طریقوں سے احکام کی علتوں کو پہچانا جاتا ہے ان میں سے کسی ایک طریقہ سے اس حکم کی علت معلوم کی جائے پھر کوئی دوسرا واقعہ پیش آئے جس کی علت اسی طرح ہو جو منصوص حکم کی علت ہو تو اس واقعہ میں بھی وہ حکم دیا جائے گا۔ جو نص والے واقعہ میں دیا گیا ہو۔ مثلاً شراب نوشی ایک واقعہ ہے جس کا حکم نص سے ثابت ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ حرام ہے اور اس کی حرمت کی وجہ نشہ اور عقل کی مخامرت ہے۔ تو گویا جو بھی ایسی چیز ہو جس میں یہ علت پائی جائے تو اس کا بھی یہی حکم ہوگا اور اس کا پینا حرام ہوگا۔

اسی طرح قرآن کریم میں جمعہ کے دن اذان ہونے کے بعد خرید و فروخت چھوڑنے یعنی بند

---

[1] علم اصول الفقہ عبدالوہاب خلاف صفحہ نمبر ا۔

[2] فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر صفحہ نمبر ۱۰۲۔

کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس لئے کہ اس میں مشغولیت کی وجہ سے نماز سے کوئی رہ نہ جائے تو اگر کوئی دوسری چیز بھی ایسی ہو جس کی وجہ سے کوئی نماز سے رہ جائے تو اس کا حکم بھی ایسا ہوگا یعنی اس کو بھی چھوڑنے کا حکم ہوگا۔

اجماع کی طرح قیاس بھی اس لئے ضروری ہے کہ ایک طرف تو قرآن و سنت کے اصول و کلیات ہیں جو اپنے ظاہری مفہوم میں محدود ہیں اور دوسری طرف حالات و تقاضا کے نئے نئے تغیرات اور ضرورت زمانہ کی نئی نئی کروٹیں ہیں جو آئے دن نت نئے مسائل پیدا کرتی رہتی ہیں ایسی حالت میں فطری طور پر اصول و کلیات اور تصریحی احکام کے عقلی مفہوم میں غور و فکر اور ان کی روح اور مزاج سے واقفیت حاصل کر کے اس حد تک ان کے دامن کو وسیع کرنے کی ضرورت ہے کہ ہر دور کے تقاضوں کو وہ اپنے اندر سمیٹ سکیں۔

قرآن کریم میں قیاس کی بنیاد کئی آیتوں میں بیان کی گئی ہے۔ مثلاً ایک جگہ ارشاد ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار (پس غور و فکر کرو اے آنکھوں والو) ۔فقہاء نے اعتبار کا معنی یوں کیا ہے۔ ردّ الشئ الی نظیره ای الحکم علی الشئ بما ثابت لنظیره (کسی شئ کو اس کی نظیر کی طرف پھیرنا یعنی جو حکم اس کی نظیر کا ہے وہی حکم اس شئ کا قرار دینا) ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔ لیتفقھوا فی الدین (تاکہ وہ دین میں فہم و بصیرت حاصل کرے) ایک اور آیت میں ہے، کہ ویعلمھم الکتاب والحکمۃ (وہ رسولؐ کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے) تو دین میں فہم و بصیرت حاصل کرنے اور دین کی حکمت سمجھنے میں قیاس ضروری کرنا پڑتا ہے۔

سنت میں بھی قیاس کی اہمیت بیان کی گئی ہے چنانچہ اس سلسلے میں معاذ بن جبلؓ کی حدیث واضح دلیل ہے جو قولی حدیث کی حیثیت رکھتی ہے جس میں ہے کہ جب حضورؐ نے معاذ بن جبلؓ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو اس سے سوال فرمایا۔ کم تقضی یا معاذ۔ (اے معاذ تم کس چیز کے ساتھ فیصلہ کرو گے؟) اُنہوں نے جواب دیا۔ بکتاب اللّٰہ (کتاب اللہ کے ساتھ) پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ فان لم تجد فی کتاب اللّٰہ۔ (اگر تم وہ مسئلہ کتاب اللہ میں نہ پاؤ) معاذ نے عرض کیا۔ بسنۃ رسول اللّٰہؐ (رسول اللہ کی سنت کے مطابق) پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ فان لم تجد فی سنۃ رسول اللّٰہ۔ (اگر تم رسول اللہ کی سنت میں بھی نہ پاؤ) معاذ نے عرض کیا۔ اجتھد برائی (میں اپنی رائے

سے اجتہاد کروں گا)۔ اس پر رسول ؐ نے ان کی تصدیق فرمائی، اور یہ لفظ ارشاد فرمائے۔ الحمد لله الذی وفق رسول رسول الله علی ما یحب ویرضاه (تمام تعریفیں اس خدا کے لئے ہیں جس نے رسول اللہ کے قاصد کو اس چیز کی توفیق بخشی جسے وہ پسند فرماتا ہے) تو حضور ؐ کا تصویب فرمانا اور خدا کی تعریف کرنا اس امر کی بین دلیل ہے کہ جس وقت کتاب وسنت میں کوئی حکم صریح موجود نہ ہو تو قیاس کرنا چاہیئے۔ تو اگر قیاس حجت نہ ہوتا تو حضور ؐ بجائے تصویب کے انکار فرماتے اور بجائے شکر کے خدا سے پناہ مانگتے اور معاذ رضؓ کو منع فرماتے۔ یہاں یہ بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ حضرت معاذ کے بارے میں حضور ؐ نے ایک جگہ فرمایا۔ اعلمهم بالحلال والحرام معاذ بن جبل رضؓ (سب سے زیادہ حلال وحرام کی وجہ جاننے والے معاذ بن جبل ؓ ہیں)

میں یہاں یہ بھی ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ حضور ؐ کے قیاس کی چند مثالیں بیان کروں۔ تاکہ اس کی اہمیت اور بھی واضح ہو جائے۔

حضور ؐ جب حجۃ الوداع میں تشریف لے گئے تو آپ سواری پر سوار تھے۔ لوگ آپ سے مسائل دریافت کرتے۔ اس وقت کے چند واقعات کتب حدیث میں نقل کئے گئے ہیں جن میں قیاس پر خود حضور ؐ کا عمل ثابت ہے۔

عن ابن عباس ؓ ان رجلاً سأل النبی ؐ ان ابی ادرکه الحج وهو شیخ کبیر لا یثبت علی راحلته وان شددته خشیت ان یموت افاحج عنه قال ارأیت لوکان علیه دین فعقنیته اکان مجزءاً قال نعم قال فحج عن ابیك وفی روایة قال فدین الله احق (ابن عباس ؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی اکرم ؐ سے دریافت کیا یا رسول اللہ ؐ میرے باپ پر حج فرض ہو گیا ہے۔ لیکن وہ بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ سواری پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر میں اسے سواری پر باندھتا ہوں تو مجھے ڈر ہے کہ وہ مر نہ جائے۔ کیا میں اس کی جانب سے حج کر سکتا ہوں۔ آپ ؐ نے فرمایا۔ اگر اس پر قرض ہوتا اور تو ادا کرتا تو کیا وہ ادا نہ ہوتا۔ اس نے عرض کیا ضرور ادا ہوتا۔ آپ ؐ نے فرمایا تو اپنے باپ کی جانب سے حج کر۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اللہ کا قرض ادائیگی کے زیادہ لائق ہے)۔

ایک اور حدیث میں ابن عباس رضؓ ہی سے روایت ہے کہ ایک عورت دریا میں سفر کر رہی تھی۔ اس نے ایک ماہ کے روزوں کی نذر مانی۔ اور روزے رکھنے سے پہلے مر گئی۔ اس کی بہن حضور ؐ

کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اپنی بہن کی نذر کا آپ سے تذکرہ کیا۔ آپ نے بہن کی جانب سے روزے رکھنے کا حکم دیا۔

اسی طرح آپ نے ایک بار ارشاد فرمایا کہ مومن کے ہر فعل پر اجر ہے حتیٰ کہ اگر وہ بیوی کے منہ میں لقمہ دے تو اس کا بھی ثواب ملتا ہے۔ اور حتیٰ کہ اگر اپنی بیوی کو پیار کرے تو اس کا بھی ثواب ملتا ہے صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ امور تو ہم اپنی خواہش نفس کے لئے انجام دیتے ہیں۔ ان میں ثواب کیسے ممکن ہے۔ آپ نے فرمایا اگر تم غیر عورت کا پیار لیتے تو کیا گناہ نہ ہوتا۔ صحابہ نے عرض کیا کیوں نہیں۔ آپ نے فرمایا۔ جب ایک شئے کو ممنوع جگہ میں استعمال کرنے سے گناہ ملتا ہے تو مباح جگہ میں ثواب کیوں نہ حاصل ہوگا، اور گناہ ثواب کی ضد ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کتاب اللہ میں محرمات کا ذکر فرمایا ہے اور اس میں ارشاد ہے۔ وان تجمعوا بین الاختین (اور یہ کہ تم دو بہنوں کو جمع کرو) اور چونکہ دو بہنوں کے جمع میں قطع رحمی ہے۔ اس لئے اس علت کو پیش نظر رکھ کر حضورؐ نے فرمایا لا یجمع بین المرأۃ و عمتها ولا بین المرأۃ وخالتها (عورت کے ساتھ اس کی پھوپھی کو اور اس کی خالہ کو جمع نہ کیا جائے)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں رضاعی ماں اور بہن سے نکاح حرام ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ وامہاتکم اللاتی ارضعنکم واخواتکم من الرضاعۃ (اور وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے اور تمہاری رضاعی بہنیں) لیکن جو علت محرمات نسبیہ میں پائی جاتی ہے۔ وہ محرمات رضاعیہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن قرآن کریم نے بقیہ رضاعی رشتوں کی حرمت کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن حضورؐ نے محرمات نسبیہ پہ قیاس فرما کر ارشاد فرمایا یحرم من الرضاع ما یحرم من النسب (رضاعت سے وہ ساری (عورتیں) حرام ہوتی ہیں جو نسب سے حرام ہیں)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ نے بھی قیاس پر پوری طرح عمل کیا۔ جو ان کی زندگیوں سے پوری طرح عیاں ہیں۔ یہاں صرف چند کو بطور مثال پیش کرتا ہوں۔

عبداللہ بن مسعودؓ سے کسی نے دریافت کیا کہ ایک شخص نے ایک عورت سے شادی کی اور مہر متعین نہیں تھا اور وہ شخص بیوی سے ہم بستر ہونے سے پہلے مرگیا۔ اس کے لئے مہر کی کیا صورت ہوگی۔ عبداللہ ایک ماہ تک ٹالتے رہے۔ لیکن جب لوگوں نے اصرار کیا تو فرمایا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کرکے فیصلہ دیتا ہوں۔

اگر یہ حق ہے تو اللہ کی جانب سے ہے اور اگر غلط ہے تو میری جانب سے ہے۔ اور فیصلہ دیا کہ اس عورت کے لئے مہرِ مثل ہے۔ نہ اس میں کمی ہوگی نہ زیادتی اور اس پر عدت لازم ہوگی اور وہ میراث کی حقدار ہوگی۔ اس پر ایک صحابی معقل بن سنان الشجعی کھڑے ہوئے اور انہوں نے فرمایا۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے ہمارے خاندان کی ایک عورت کے بارے میں فرمایا تھا جس کا نام بروع بنت واشق تھا کہ اس نے ایک شخص سے نکاح کیا اور وہ شخص ہم بستر ہونے سے قبل انتقال کرگیا۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اس عورت کے لئے مہرِ مثل ہوگا اور میراث ہوگی اور عدت گنا رے گی۔ عبداللہ بن مسعود نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور اللہ اکبر فرمایا۔

اس طرح ایک روایت میں ہے کہ دبرۃ الصلتی کہتے ہیں کہ مجھے خالد بن ولیدؓ نے حضرت عمرؓ کے پاس بھیجا جب میں وہاں پہنچا تو علیؓ طلحہؓ، زبیرؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ ان کے پاس بیٹھے تھے۔ میں نے کہا۔ خالدؓ آپ کو سلام کہتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ لوگ شراب نوشی میں لطف لینے لگے ہیں اور وہ اس کی سزا کو حقیر اور معمولی سمجھتے ہیں۔ لہٰذا آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا میری رائے یہ ہے کہ جب آدمی شراب پیتا ہے تو نشہ میں مدہوش ہوکر بکواس کرتا ہے اور بکواس کی صورت میں ہر کسی پر تہمت لگاتا ہے۔ اور تہمت لگانے والے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اسّی کوڑے سزا مقرر کی ہے۔ اس لئے شرابی کی سزا بھی اسّی کوڑے ہونی چاہیئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اے دبرہ تم خالد کو جاکر ان لوگوں کا فیصلہ سناؤ۔ اور اس روز سے شراب کی حد اسّی کوڑے متعین ہوئی۔

یہی وجہ ہے کہ تمام امت کا اتفاق ہے کہ قیاس شرعی دلائل میں سے چوتھی دلیل ہے، اور اس پر اس وقت عمل واجب ہوتا ہے جبکہ پہلے تین شرعی دلائل یعنی کتاب اللہ، سنت اور اجماع میں پیش آمدہ واقعہ کے لئے کوئی حکم موجود نہ ہو۔ لیکن روافض، خوارج اور ظاہریہ نے قیاس کے حجت سے انکار کیا ہے۔ چونکہ ان کے دلائل زیادہ قوی نہیں ہیں۔ اس لئے جمہور نے ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی ہے۔ ان کی بڑی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ونزلنا علیك الكتاب تبیاناً لكل شیئ (ہم نے آپ پر کتاب نازل کی جو ہر شئے کو ظاہر کرنے والی ہے) چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ جب کتاب اللہ میں ہر چیز کا بیان موجود ہے تو قیاس کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن اگر ان لوگوں کی اس دلیل کو تسلیم کرلیا جائے تو پھر تو سنت اور اجماع بھی دلائل شرعیہ سے خارج ہوں گے۔ حالانکہ ان کو وہ بھی

دلائل شرعیہ تسلیم کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ

قیاس میں یہ ضروری ہے کہ اصل چیز جو حکم ہو اس کی علت معلوم کی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کس وصف اور سبب کی وجہ سے اس چیز کا حکم قرآن، سنت یا اجماع میں دیا گیا ہے۔ تاکہ یہی علت دوسری جگہ اسی قسم کے حکم کے لئے بنیاد بنائی جائے یہ علت کبھی کبھی جلی اور ظاہر ہوتی ہے یعنی اس کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ جیسا کہ بلی کا جھوٹا پاک ہونے کے لئے حضورؐ نے فرمایا انھا من الطوفین علیکم او الطوافات (یہ بلی تمہارے گھر کے اندر بہت زیادہ آمد و رفت کرنے والی ہے) اور کبھی خفی ہوتی ہے یعنی وہ بعض کی سمجھ میں آجاتی ہے اور بعض کی سمجھ میں نہیں آتی جیسا کہ سود کی علت اس حدیث میں جس میں حضورؐ نے چھ چیزوں کو زیادتی پہ دینے کو سود فرمایا ہے۔ تو حنفیہ کے نزدیک اس میں علت قدر وجنس علت ہے۔ امام شافعی کے نزدیک اشیائے ماکولات میں غذائی صلاحیت اور سونا چاندی میں ثمنیت ہے اور امام مالک کے نزدیک آئندہ کے لئے دو کے رکھنے اور ذخیرہ کرنے کی صلاحیت ہے۔

مندرجہ بالا چار ماخذ پہ فقہا کا اتفاق ہے لیکن ان چار ماخذ کے علاوہ اور بھی ماخذ ہیں جن میں فقہا کا اختلاف ہے۔ اس لئے اب میں ان کا مختصراً ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

استحسان

استحسان کے لغوی معنی کسی چیز کو اچھا اور مستحسن سمجھنا ہے اور فقہی اصطلاح میں کسی مسئلہ کے دو پہلوؤں میں ایک کو کسی معقول دلیل کی بنا پہ ترجیح دینے کا نام ہے۔ اصول فقہ کی کتابوں میں استحسان کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ مثلاً "کسی مسئلہ کے حکم کو قوی وجہ کی بنا پر اس کے نظائر سے الگ کر لینا" ایک اور تعریف یوں کی گئی ہے "استحسان ظاہری قیاس چھوڑ کر اس چیز کو اختیار کرنے کا نام ہے جو لوگوں کی ضرورتوں کے زیادہ موافق ہو"

استحسان ان مسئلوں میں سہولت ڈھونڈنے کا نام ہے جن میں خاص و عام سب مبتلا ہیں چنانچہ ایک اور تعریف یوں کی گئی ہے۔ استحسان وسعت کو اختیار کرنے اور فراخی کی تلاش کرنے کا نام ہے۔ ان سب تعریفوں کا حاصل یہ ہے کہ مشکل کو چھوڑ کر آسان صورت اختیار کرنا بھی استحسان ہے

جو قرآن کریم کی اس آیت سے بھی واضح ہے۔ یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (اللہ تمہارے لئے آسانی اور سہولت چاہتا ہے تم کو دشواری اور مشکل میں نہیں چاہتا)

استحسان کی ضرورت اس لئے پڑتی ہے کہ انسانی ضرورتوں اور مصلحتوں کا دامن اس قدر وسیع ہے کہ قاعدہ وقانون میں ان کا سمیٹنا نہایت مشکل ہے۔ ضرورتوں اور مصلحتوں کی بنیاد پہلے پڑتی ہے۔ پھر انہیں منظم شکل دینے کے لئے قاعدہ وقانون مقرر کئے جاتے ہیں۔ زمان ومکان کے لحاظ سے ان میں بے شمار اور نت نئی ضرورتیں ایسی ناگزیر صورتیں اختیار کرلیتی ہیں کہ کبھی قیاس کی وسیع حدیں بھی ان کے لئے تنگ اور ضرر رساں ثابت ہوتی ہیں۔ ایسی حالت میں فقہا ضرورت کو معیار بناکر اس کے مطابق حکم کی تلاش کرتے ہیں اور لوگوں کے لئے ضرر رساں پہلو چھوڑ کر مفید پہلو اختیار کرتے ہیں تاکہ حکمت الٰہی کے ساتھ ہم آہنگی ہو اور اس طرح فلاح و بہبود میں اضافہ اور مضرتوں کا دفعیہ ہوسکے کیونکہ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔ وما جعل علیکم فی الدین من حرج (اللہ نے دین میں تمہارے اوپر کوئی تنگی نہیں کی ہے) ایک اور جگہ ارشاد ہے۔ لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا (اللہ تعالےٰ کسی کو اس کی وسعت اور برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا)

اس کے علاوہ سنت رسول اللہ میں ہے کہ آپ نے فرمایا۔ خیر دینکم الیسر (تمہارا اچھا دین آسانی ہے) ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا بعثتم میسرین ولا معسرین (تمہیں آسانی کے لئے بھیجا گیا ہے نہ کہ تنگی کے لئے) نیز ایک روایت میں ہے۔ ما راٰہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن (جس کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک اچھا ہے)

فقہا کے نزدیک قیاس خفی ہی استحسان ہے اور اس کی چار قسمیں ہیں:۔

(۱) استحسان سنت (۲) استحسان اجماع (۳) استحسان ضرورت (۴) استحسان قیاس۔

ان کی مثالیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) بیع سلم (جس مال پر معاملہ کیا گیا ہو وہ موجود نہ ہو بلکہ بعد میں حوالہ کیا جائے) کا معاملہ ہے قیاس ظاہر کے مطابق درست نہ ہونی چاہئے، کیونکہ جو چیز بیچی جاتی ہے وہ موجود نہیں ہوتی، حالانکہ شئے کی موجودگی بیع کی صحت کے لئے ضروری ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی بناء پر قیاس چھوڑ کر

استحسان پر عمل کیا جاتا ہے۔ من اسلم منکم فلیسلم فی کیل معلوم ووزن معلوم الی اجل معلوم۔ (جو شخص تم میں سے بیع سلم کرنا چاہے، اس کو چاہیئے کہ پیمانہ وزن اور مدت متعین کر کے کرے)

۲۔ قیاس ظاہر کے مقابلہ میں اجماع کی مثال :۔ مثلاً قیمت طے کر کے جوتا بنانے کا آرڈر دیا اور اس کی ناپ بھی دے دی۔ قیاس ظاہر کے مطابق یہ معاملہ درست نہ ہونا چاہیئے کیونکہ جوتا بعد میں تیار ہوگا۔ معاملہ کے وقت وہ موجود نہیں ہے۔ لیکن لوگوں کے عمل درآمد کی بنا پر گویا اجماع ہوگیا ہے کہ یہ معاملہ جائز ہے اس لئے قیاس چھوڑ کر استحسان پر عمل ہوگا۔

۳۔ قیاس ظاہر کے مقابلہ میں ضرورت کی مثال :۔ مثلاً برتن جب ناپاک ہو جائے تو اس کے پاک کرنے کی کوئی صورت نہ ہونی چاہیئے کیونکہ وہ نچوڑے نہیں جا سکتے اور قیاسی قاعدہ کے مطابق نجاست نکالنے کے لئے نچوڑنا ضروری ہے لیکن ضرورت اور حرج کے دفعیہ کی بنا پر قیاس چھوڑ دیا جائے گا۔ اور استحسان پر عمل کر کے دھونے کے بعد ان کی پاکی کا حکم لگایا جائے گا۔ اسی طرح اگر کنواں اور حوض جب ناپاک ہو جائیں تو ان کی پاکی کی کوئی صورت نہ ہونی چاہیئے، کیونکہ ان میں نجاست کا اثر بہر حال باقی رہتا ہے لیکن ضرورت کی بنا پر قیاس چھوڑ کر استحسان پر عمل کر کے ان کی پاکی کا حکم دیا گیا۔

۴۔ قیاس ظاہر کے مقابلہ میں قیاس خفی کی مثال :۔ مثلاً جانوروں کا گوشت حرام ہے ان کا جوٹھا بھی حرام ہے، کیونکہ جھوٹے کا لعاب ہوتا ہے۔ اس اصول کی بنا پر پنجہ سے شکار کرنے والے پرندوں کا جھوٹا حرام ہونا چاہیئے، کیونکہ ان کا گوشت حرام ہے، لیکن قیاس خفی یہ ہے کہ پرندے چونچ سے کھاتے پیتے ہیں۔ چونچ ہڈی ہوتی ہے، جو زندہ مردہ سب کی پاک ہے، کھاتے پیتے وقت یہ خلاف درندوں کے جو ٹھے کے کہ وہ زبان سے کھاتے پیتے ہیں، اور زبان پر نجس لعاب ہوتا ہے جو حرام گوشت سے بنا ہے، یہ نجس لعاب پاک چیز سے ملے گا تو لازمی طور سے اس کو ناپاک بنا دے گا۔ اس بنا پر پرندہ کو درندہ پر قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا اور قیاس ظاہر چھوڑ کر استحسان (قیاس خفی) پر عمل کیا جائے گا۔

فقہا حنفیہ استحسان کے قائل ہیں۔ اور اس کے ذریعے انہوں نے فقہ کی بڑی مفید خدمت انجام دی ہے۔ فقہا حنابلہ نے بھی اس اصول کے ذریعے مسائل کا استنباط کیا ہے۔ امام مالک نے اصول استحسان کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ مثلاً قیاس کے مقابل جب عرف غالب

آ جائے یا کوئی ترجیح دینے والی مصلحت پائی جائے یا قیاس پر عمل کرنے سے نقصان ہوتا ہو اور مشقت اور دشواری پیش آتی ہو تو ان سب صورتوں میں امام مالک کے نزدیک قیاس چھوڑ دیا جائے گا اور استحسان پر عمل ہوگا۔ البتہ امام شافعی نے اس کی مخالفت کی ہے۔ لیکن غالباً ان کی مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ یہ لفظ انسانی میلان اور خواہش کے دخل پر دلالت کرتا ہے اس بنا پر انہوں نے اس لفظ کو مستقل اصول کی حیثیت دینا پسند نہ کیا ہو۔

اس کے علاوہ شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ جلد اول میں استحسان کی مخالفت کی ہے۔ لیکن وہ غالباً استحسان کے آزادانہ استعمال اور اس کے مقرر کردہ اصول و ضوابط کی رعایت نہ کرنے کی صورت میں ہے ورنہ ملی اور ملکی مصالح کے پیش نظر استحسان کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ جس سے کسی بھی صاحب بصیرت کو انکار نہیں ہو سکتا۔

مصالح مرسلہ

فقہا اصطلاح میں عرف ضرورت اور مصلحت کو بنیاد بنا کر مسائل استنباط کرنے کا نام مصالح مرسلہ یا استصلاح ہے اس کی تعریف یوں کی گئی ہے۔ مصالح عامہ کے اقتضا پر احکام و مسائل کی بنیاد قائم کرنا۔

امام مالک مصالح مرسلہ کے اصول کے قائل ہیں۔ اس لئے یہ اصول ان کی جانب منسوب ہے۔

فقہاء نے مصالح مرسلہ سے کام لینے کی درج ذیل شرائط مقرر کی ہیں۔

(۱) یہ کہ مصالح ان مصالح کے مشابہ ہوں جن کا شارع نے اعتبار کیا ہے۔

(۲) قطعیہ ہوں کہ ان مصالح کے حصول کا یقین ہو۔

(۳) ملک و ملت کے عمومی فائدہ اور مصلحت سے ان کا تعلق ہو۔ یعنی یہ کہ جن مصالح کا حصول مقصود اور مضرت کا دفعیہ منظور ہو وہ بنیادی اصول اور کلی پالیسی کے خلاف نہ ہوں اگرچہ کہیں ان کا ذکر موجود نہ ہو۔ جیسا کہ اس کی تائید ذیل میں علامہ شاطبی کے اس قول سے ہوتی ہے۔

کل اصل شرعی لم یشھد لہ نص معین وکان ملائما لتصرفات الشرع وما